تفسیر
سورۂ قیامہ

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

مَكِّيَّةٌ ______ آیات : ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿۲﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿۶﴾ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ سكتہ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾

ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

مجھے روزِ محشر کی قسم، اور نفسِ ملامت گر کی قسم، کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی یکجا نہ کریں گے؟ ہاں، ہم اس کے پور پور کو ٹھیک کر سکتے ہیں، مگر آدمی اس کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے، پوچھتا ہے روزِ محشر کب ہے؟ لیکن جب نگاہ خیرہ ہوگی اور چاند گہنائے گا اور چاند سورج یکجا ہوں گے، تب آدمی کہے گا کہاں بھاگوں؟ کچھ نہیں، کہیں بچاؤ نہیں، تیرے خداوند کے یہاں ٹھکانا ہے۔ اس دن آدمی کو جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا بتایا جائے گا، بلکہ انسان اپنے لیے آپ سوجھ ہے، اگرچہ اپنے بہانے پیش کرے۔ نہ چلا اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو کہ جلدی سیکھ لے۔ ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا، پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کر، پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی تفصیل۔ کچھ نہیں بلکہ تم دنیا کو چاہتے ہو، اور آخرت کو چھوڑتے ہو، کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے، اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر، اور کتنے چہرے اداس ہوں گے، گمان کریں گے کہ ان پر کمر توڑنے والی مصیبت ٹوٹے گی۔ کچھ نہیں جب جان ہنسلی تک آ پہنچے گی، اور پکاریں گے کون ہے جھاڑنے پھونکنے والا، اور گمان کرے گا کہ یہ جدائی کی گھڑی ہے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹے گی۔ تیرے خداوند کی طرف اس دن چلنا ہے۔ پس نہ سچ مانا اور نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا، پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے، پھر افسوس ہے اور افسوس ہے۔ کیا انسان سمجھتا ہے کہ وہ بے قید چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ ٹپکائی ہوئی منی کی

ایک بوند نہ تھا، پھر ہوا لہو کی ایک پھٹکی، پھر اس کو خلق کیا اور درست کیا۔ پس بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ، کیا وہ خداوند قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟

۱۔ اس سورہ کا عمود، منکرینِ قیامت و جزا کے شبہات کی تردید ہے۔

ان کے انکار کی بنیاد دو چیزیں تھیں۔

ا۔ دنیائے فانی کی محبت۔ قاعدہ ہے کہ انسان جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔

ب۔ اطاعت اور تقویٰ سے متکبرانہ اعراض۔ اس لیے کہ طمعِ مال اور حُبِّ جاہ کی آرزوئیں انسان کو ایک پرفریب جال میں پھنسا لیتی ہیں۔

چنانچہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ان دو باتوں کا ذکر فرمایا ہے۔

امرِ اوّل کا ذکر یوں فرمایا:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ — کچھ نہیں تم دنیا کو چاہتے ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔

دوسری بات کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى — پس نہ تو سچ مانا، نہ نماز پڑھی، بلکہ انکار کیا اور منہ موڑا پھر اپنے لوگوں میں اکڑتا ہوا چل دیا۔

پہلی تصویر ان لوگوں کی تھی جو دنیا سے محبت کرتے ہیں، یہ دوسری تصویر ان لوگوں کی ہے جو اپنے اہل و مال کے گھمنڈ میں خدا سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

جس شبہ کو ان لوگوں نے اپنے انکار کے لیے آڑ بنایا تھا، یہ وہی عام شبہ تھا جس کو قرآن نے خود انہی کی زبانی بار بار نقل کیا ہے۔ مثلاً اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے، تب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔) دوسری جگہ ہے هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (ان ہونی بات ہے ان ہونی بات ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے) قرآن نے اس شبہ کے جواب کے لیے طریقہ ایسا اختیار فرمایا جو بالکل ان کے حسبِ حال بھی ہو، اور جو ان کے شبہ کو دور کر کے ان کو غفلت کی نیند سے جگا بھی دے۔ چنانچہ اس سورہ میں ایسی تنبیہات اور ایسی دلیلیں جمع کی گئی ہیں جو مخاطب کو پوری طرح قائل اور ہوشیار کر دینے کے لیے بالکل کافی ہیں۔

اس سورہ کے اسلوبِ استدلال سے متعلق ایک اور خاص بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔ سابق سورہ میں ان کے تکبر و انکار کی پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا تھا اور ساتھ ہی جہاں تک زجر و توبیخ کی ضرورت تھی کلام میں اس کا حصہ بھی موجود تھا، اس وجہ سے اس سورہ میں ان کے انکار و استکبار کی تفصیل نہیں کی گئی بلکہ زیادہ تر دلائل بیان ہوئے۔

اور کلام کو موثر اور دل نشین بنانے کے لیے ضروری تھا کہ ایسا ہی ہو۔ ایک کاریگر پہلے لوہے کو تپا کر نرم کرتا ہے پھر اس پر ہتھوڑا مارتا ہے۔ یہی صورت ایک داعی اس وقت اختیار کرتا ہے جب مخاطب کوئی متکبر اور جھگڑالو قوم ہو۔ وہ پہلے جھڑکیوں اور تنبیہات سے دلوں کو نرم کرتا ہے تاکہ ان میں بات کو سننے کی صلاحیت پیدا ہو۔ پھر ان کے بعد ان کے سامنے دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ فطرت انسانی کی اسی رعایت کی وجہ سے قہر و غضب کی وہ شدت جو پہلی سورت میں نظر آتی ہے اس سورہ میں نہیں ہے، اگرچہ اس کی گرمی کسی قدر اس میں بھی ہے۔ سابق سورہ کا انداز بہت ہی تیز ہے، مثلاً فرمایا ہے:۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَبَنِينَ شُهُودًا وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ...... فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ (مدثر ۱۱-۵۱)

چھوڑ دے مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے بنایا تنہا اور دیا اس کو مال کثیر اور بیٹے حاضر ہونے والے، اور اس کی راہ ہموار کی جیسی چاہیے، پھر متوقع ہے کہ اور زیادہ دوں گا، ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔ اس کو چڑھاؤں گا ایک چڑھائی۔ اس نے سوچا اور اندازہ کیا، پس ہلاک ہو کیسا اندازہ کیا، پھر نگاہ کی، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بنایا، پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا اور کہا یہ تو بس جادو ہے جو پہلوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے، نہیں ہے یہ مگر انسان کی بات، میں اس کو داخل کروں گا سقر میں اور تجھے کیا معلوم سقر کیا ہے، نہ باقی رکھے گی نہ چھوڑے گی ...... ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یاددہانی سے اعراض کر رہے ہیں گویا بدکے ہوئے گدھے ہیں، بھاگے ہیں شیر سے۔

اس کلام کو سامنے رکھ کر اگر سورۂ قیامہ کے انداز بیان کو دیکھو گے تو تمہیں دونوں میں نمایاں فرق محسوس ہوگا، اس میں کلام کی یہ شعلہ فشانی نہیں ہے۔

۲۔ تاہم غضب کی کچھ چنگاریاں اس میں بھی دبی ہوئی ہیں جن کو ایک صاحب ذوق بآسانی محسوس کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس میں پہلے انسان کی جرأت اور سرکشی کا ذکر ہے۔ پھر اس کے جواب میں جھڑکی اور دھمکی کا انداز ہے، نیز اس میں استفہام اور تہدید کا اسلوب بار بار استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ سورہ، جیسا کہ ہم نے پہلی فصل میں بیان کیا ہے، اپنے اسلوب کے اعتبار سے پہلی سورت سے بالکل ہی مختلف نہیں ہے بلکہ بہت کچھ ملتی جلتی ہوئی ہے۔ چنانچہ دیکھو، اس سورت میں انسان کا یہ قول نقل کیا کہ وہ پوچھتا ہے "روز محشر کب آئے گا؟" اور یہ اس کے انتہائی تمرد و سرکشی کی دلیل ہے۔ کیونکہ اس تفصیل و توضیح اور اس اتمام حجت کے بعد، جو قرآن نے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے اختیار فرمائی ہے، کسی کے لیے اس

سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن محض اس وجہ سے کہ وہ دن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ہم کو تھوڑی سی مہلت اصلاح حال اور توبہ کے لیے دے رکھی ہے، انسان اکڑتا ہے اور مذاق سے پوچھتا ہے کہ "وہ دن کب آئے گا، اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا، آخر یہ جہاز کہاں لنگر انداز ہو گیا"۔ انسان کی یہ ذہنی حالت مقتضی ہوئی کہ اس مذاق کے جواب میں جھڑکی اور تہدید ہی کا پہلو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ دیکھو جواب میں اس دن کے آنے کی تاریخ نہیں بتائی بلکہ اس دن ان کی جو حالت ہوگی اس کی تصویر ان کے سامنے رکھ دی ہے۔ قرآن نے جواب کا یہ اسلوب اکثر اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً سورۂ ذاریات میں ہے:

يَسْأَلُونَ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ۔

پوچھتے ہیں کب ہے دن جزا کا؟ جس وقت وہ آگ پر تپائے جائیں گے۔ چکھو مزہ اپنے فتنہ کا، یہی وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے۔

اسی اسلوب پر یہاں بھی جواب کے لیے ایسا پیرایہ اختیار فرمایا جو ان کی اس منکرانہ اور متکبرانہ ذہنیت کے مناسب ہو۔ فرمایا:

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ۔

لیکن جب نگاہ خیرہ ہوگی اور چاند گہنائے گا، اور چاند سورج یک جا ہوں گے، تب آدمی کہے گا کہاں بھاگوں۔

یعنی آج تو وہ دن بہت دور نظر آتا ہے اور وہ گھمنڈ کے نشہ میں اس کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔ لیکن جب وہ سامنے آ جائے گا تو گھبراہٹ کی بدحواسی میں کہیں گے کہ اَيْنَ الْمَفَرُّ (کہاں بھاگ کے چلے جائیں) پھر اس دن ان کی جو حالت ہوگی اس کی پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ أَن يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ

اور بہت سے چہرے اس دن اداس ہوں گے گمان کریں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑنے والی مصیبت ٹوٹے گی۔

ان کے متکبرانہ سوال کے بعد ان کے متکبرانہ اعراض کا ذکر فرمایا:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ

پس نہ سچ مانا، نہ نماز پڑھی بلکہ انکار کیا اور منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔

پھر ان کی اس حالت پر بانداز حسرت افسوس کیا:

أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ

افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے، پھر افسوس ہے تجھ پر اور افسوس ہے۔

اس طرح کی حسرت کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ملتی ہیں، مثلاً:

يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ۔ (یٰس ۔ ۳۰)

افسوس ہے بندوں پر نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔

جس طرح 'ویل' کا لفظ جھڑکی اور غصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اولی کا لفظ اظہار حسرت کے لیے آتا ہے۔ خنساء کا شعر ہے۔

هممت بنفسي كل الهموم فاولى لنفسي اولى لها

یہاں ایک اور خاص بات اس اسلوب سے متعلق قابل لحاظ ہے کہ اَوْلٰی لَکَ میں ضمیر بجائے غائب، کے مخاطب کی آگئی ہے، حالانکہ پہلے سے کلام غَیبت کے اسلوب پر چل رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کو مؤثر اور پر زور بنانے کے لیے یہی اسلوب موزوں تھا۔ اگر اولی لک فاولی" کے بجائے" اَوْلٰی لَہٗ فَاَوْلٰی" ہوتا تو کلام میں یہ تاثیر نہ پیدا ہوتی۔ علاوہ ازیں کلام شروع سے اخیر تک بالکل استفہام کے اسلوب میں ڈھلا ہوا ہے، اس کا سبب بھی یہی ہے، کیونکہ یہ پوری سورہ اول سے اخیر تک زجر و توبیخ پر مشتمل ہے۔

۳۔ اس سورہ میں جھڑکی اور سوال کے جو مواقع ہیں ان کے محاسن کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایک باریک بات کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں، اس کو خوب غور سے سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ جب خطاب بانداز عتاب ہوتا ہے تو اس وقت کلام میں فصل اور التفات اور ظاہری بے ربطی بہت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا متکلم غصہ میں ہے بات شروع کرتا ہے، پھر رک جاتا ہے اور غصہ کا گھونٹ پی کر پھر دوسرے اسلوب پر بات شروع کرتا ہے اور خاتمۂ کلام عموماً جھڑکی پر ہوتا ہے۔ اس طرح کے التفات کی مثالیں شعراء عرب کے کلام میں بھی بہت ملتی ہیں، مثلاً ایک شاعر ایک بات کہتا چلا جا رہا ہے پھر دفعتہً اس بات کو کاٹ کر کہتا ہے فدع خا وسل الھم عنک بجسرۃ یعنی (ان باتوں کو چھوڑ اور اپنے دل کا غم دور کرو اور ایسی ایسی اونٹنی سے اپنے اس ارادہ کو پورا کرو جو تمہارے دل میں ہے)

اس سورت کے اسلوب کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے سورہ علق، سورۂ تکاثر، اور سورۂ ہمزہ کے اسالیب پر بار بار غور کرنا چاہیے۔ یہ سورتیں اس کے اسلوب سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ ان میں غضب کی نمود بھی ہے ساس اسلوب کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے ہم چاہتے ہیں کہ سورہ کے مضمون کا بالکل سادہ اور مختصر خاکہ تمہارے سامنے رکھ دیں اس کو سادہ اور اختصار کے انداز میں یوں سمجھو۔

"کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اٹھایا نہ جائے گا، جزا نہ ہوگی؟ شرارت کی وجہ سے کہتا ہے کہ وہ دن کب آئے گا؟ جب آجائے گا تو بھاگ نہ سکے گا۔ ہرگز نہیں اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں۔ اللہ ہی کی طرف ٹھکانا ہے۔ بلکہ انسان باوجود بصیرت کے اندھا بنتا ہے۔ کچھ نہیں وہ دنیا کو چاہتا ہے اور آخرت کو چھوڑتا ہے۔ کچھ نہیں جب جان ہنسلی میں آ پھنسے گی اور وہ اپنے پروردگار کے پاس لے جایا جائے گا تو اس وقت دنیا اس کے کس کام آئے گی"

اس مضمون پر غور کرو، التفات اور ظاہری فصل اور بے ربطی اس میں کس قدر نمایاں ہے۔ حالانکہ پورا کلام نہایت مربوط اور متصل ہے۔ کلام کا یہ انداز متکلم کے غضب اور مخاطب کی شقاوت کو ظاہر کرتا ہے۔

اس میں اسلوب التفات کی سب سے زیادہ نمایاں مثال آیت لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ہے۔ اس کی تفسیر ہم آگے بیان کریں گے۔

۴۔ اوپر جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوا کہ سورہ زجر و توبیخ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے جو شخص عربی زبان کی بلاغت کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہ ہوگا وہ اس سورہ کے منطقی اور استدلالی پہلو کو بالکل نہ سمجھ سکے گا۔ وہ اس کو بیان و استدلال کی عام کسوٹی پر پرکھنا چاہے گا اور یہ کلام بیان و استدلال کی عام روش سے بالکل الگ ہے۔

اس کلام کے استدلالی پہلو کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کو بلاغت کی خیرہ کر دینے والی شعاعوں کے حصار سے الگ کیا جائے۔ بغیر اس کے کمزور نگاہیں اس کی خوبیوں کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ یہ کلام اپنے سادہ رنگ میں یوں ہوگا۔

"انسان نے قیامت کا انکار کیا اور با دہانی سے اعراض کیا اور خیال کیا کہ وہ غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا اپنے اعمال کا بدلہ نہ پائے گا۔ چنانچہ اس کو اس سے ہوشیار کیا گیا لیکن وہ مذاق سے پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا؟ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ غیر مسئول نہ رہ سکے گا بلکہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور اپنے برے بھلے اعمال کا بدلہ پائے گا۔ ہم اس کی ہڈیاں جمع کریں گے اور ان کے پور پور کو جوڑ دیں گے۔ ابھی وہ غرور کی بدمستی میں ہے۔ لیکن جب یہ واقعہ پیش آچکے گا تب وہ آنکھیں کھولے گا اور اس کا اقرار کرے گا کیونکہ وہ دن خود اس کے سامنے اپنی گواہی دے گا بلکہ خود اس کے نفس لوامہ نے اس کے سامنے اس کی گواہی دی۔ لیکن اس دنیائے فانی کی محبت نے اس کو آخرت سے غافل رکھا۔ پس ضرورت ہے کہ اس کو کچھ دیر مہلت دی جائے کہ وہ اس بات کو سمجھ سکے۔ کیا وہ موت کو نہیں یاد کرتا کہ اس دنیائے فانی سے اس کو ایک دن کوچ کرنا ہے اور اپنے پروردگار سے ملنا ہے اگر ایسا کرتا تو وہ صدقہ دیتا اور نماز پڑھتا۔ کیا وہ اپنی پیدائش کے معاملہ پر غور نہیں کرتا۔ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا وہ اس بات پر قادر ہے کہ دوبارہ پیدا کر دے۔"

اس سادہ بساط پر تم کلام کی منطق کو بالکل بے نقاب دیکھ سکتے ہو لیکن اس انداز بیان کو قرآن کے انداز بیان سے کیا نسبت۔ یہی ذرے ہیں جن کو قرآن کے نظم اور اس کے اعجاز بیان نے آفتاب بنا دیا ہے۔ نہ وہ تمہاری گرفت میں آسکتے نہ تم ان پر نگاہ جما کر ان کو دیکھ سکتے۔ البتہ جو قرآن پر تدبر کرتے ہیں وہ اس کر ٹک اور دمک کے اندر بھی قرآن کے دلائل کو دیکھ ہی لیتے ہیں اور ان سے وہ اطمینان قلب اور تشفی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۔ (الزمر - ۲۳)	اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں پھر ان کے جسم اور ان کے دل خدا کی یاد کی طرف جھک جاتے ہیں۔

جب آیات کی صحیح تاویل سمجھ لینے کے بعد تم پورے مجموعہ پر غور کرو گے تو دلیل کا پہلو بالکل واضح ہو جائے گا۔ اس وقت ہم کلام کے اجزا اور کلمات کی تشریح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۵۔ "لَا اُقْسِمُ" میں 'لا' منفصل یعنی جملہ سے بالکل الگ ہے اور مخاطب کے خیال کی تردید کر رہا ہے۔ یعنی انسان نے

یہ جو خیال کر رکھا ہے کہ قیامت نہیں آئے گی، بالکل غلط ہے۔ قیامت ضرور آئے گی۔ بعض لوگوں نے 'لا' کو زائد مانا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ مذہب نہایت غلط ہے۔ بعض اس کو متصل یعنی 'اُقْسِمُ' سے لگا ہوا مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مذہب بھی صحیح نہیں ہے۔ اولاً تو اس صورت میں آیت کے معنی بگڑ جاتے ہیں، ثانیاً قرآن کی تصریحات علانیہ اس مذہب کے خلاف ہیں، مثلاً فرمایا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ۔

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مواقع کی اور بے شک اگر تم جانو تو یہ بہت بڑی شہادت ہے۔

اگر اس کو متصل مانا جائے تو یہ کہنے کے بعد کہ "میں نہیں قسم کھاتا" یہ کہنے کے کیا معنی کہ "اگر تم جانو تو یہ بہت بڑی قسم ہے"۔ مزید تفصیل کے لیے آیت کی تفسیر پڑھنی چاہیے۔

قسم سے پہلے 'لا' کا منفصل آنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ 'کلا' بھی بالکل اسی نوعیت سے آیا کرتا ہے۔ مثلاً کَلَّا وَالْقَمَرِ (کچھ نہیں چاند کی قسم) اور ان دونوں کی تکرار بھی بالکل یکساں نوعیت و حالت رکھتی ہے۔ مثلاً کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ، ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔

یہ اسلوب کلام عموماً اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کسی سابق خیال کی شدت کے ساتھ تردید کرنی ہو کیونکہ 'لا' کا مقدم ہونا اس امر پر کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ کلام اس بات کی تردید کر رہا ہے جو پہلے کہی گئی ہے، نیز یہ کہ اس بات کی کراہت اور لغویت اس درجہ واضح ہے کہ اس کی تردید میں ایک لمحہ کے توقف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نتیجہ یوں نکلتا ہے کہ قسم کے باب میں عام عادت یہ ہے کہ وہ ابتدائے کلام میں آئے۔ پس جب انکار کا لفظ اس پر بھی مقدم ہو تو اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ مقصود انکار میں غایت درجہ اہتمام ہے۔

یہاں ایک خاص نکتہ اور بھی ملحوظ رہے کہ قسم بالعموم اثبات کی تاکید کے لیے آتی ہے۔ پس جب کبھی ایسا ہو کہ وہ انکار کی تاکید کے لیے آئے تو بلیغ اسلوب کلام یہی ہوگا کہ نفی کلام پر مقدم ہو۔ چنانچہ دیکھو بولتے ہیں 'لا واللہ' (نہیں، خدا کی قسم) 'واللہ، لا' (خدا کی قسم، نہیں) نہیں کہتے، اگر یوں بولیں تو تاکید انکار کا سارا زور ہی ختم ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی آیت ذیل اسی اسلوب پر وارد ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ (النساء-۶۵)

پس نہیں، تیرے پروردگار کی قسم وہ سچے مومن نہ ہوں گے تاآنکہ وہ تجھ کو آپس کے اختلافات میں حکم نہ بنائیں اور پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے کوئی تنگی نہ محسوس کریں۔

یہی اسلوب نابغہ ذبیانی نے استعمال کیا ہے:

فلا لعمر الذی مسحت کعبتہ وما هریق علی الانصاب من جسد

پس نہیں، اس ذات کی قسم جس کے کعبہ کا میں نے طواف کیا اور ان خونوں کی قسم جو تھانوں پہ بہائے گئے۔

والمومن العائذات الطیر تمسحها رکبان مکة بین الغیل والسعد

اور اس ذات کی قسم جس نے پرندوں کو پناہ دی، مکہ جانے والے قافلے غیل وسعد کے درمیان ان پر گزرتے ہیں اور کوئی ان کو چھیڑتا نہیں۔

ماقلت من سیء مما أتیت بہ اذا فلا رفعت سوطی الی یدی

کہ جو بری باتیں تجھ کو پہنچائی گئی ہیں میں نے ان میں سے ایک بھی نہیں کہی اگر کہی ہو تو میرا ہاتھ مجھے کوڑا اٹھا کر نہ دے سکے۔

پھر وہی کہتا ہے:

فلا عمر الذی اثنی علیہ وما رفع الحجیج الی الال

پس نہیں اس ذات کی قسم جس کی میں ثنا کرتا ہوں اور ان صداؤں کی قسم جن کو بلند کرتے ہوئے حجاج جبل الال کی طرف بڑھتے ہیں۔

لما اغفلت شکرک فانتصحنی وکیف ومن عطائک جل مالی

(میں نے تمہاری سپاس گزاری کے فرض کو کبھی نظر انداز نہیں کیا پس مجھے اپنا خیر سگال سمجھو۔ اور یہ کیسے ممکن تھا جب کہ میرے پاس جو کچھ مال ومتاع ہے بیشتر تمہارے ہی جود وکرم کا صدقہ ہے)

امرؤ القیس کا شعر ہے:

فلا وابیک ابنة العامری لا یدعی القوم انی افر

پس نہیں تیرے باپ کی قسم، اے عامری کی بیٹی! بنو تمیم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ میں میدان جنگ چھوڑ کے بھاگ جاتا ہوں۔

قرآن مجید اور کلام عرب کے جو شواہد یہاں ہم نے نقل کیے ہیں، ان میں قسم محض انکار کے لیے ہے اس وجہ سے جس بات کا انکار مقصود ہے اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب قسم ایک ہی ساتھ انکار اور اثبات دونوں پر مشتمل ہو تو وہاں اس کے بعد کوئی ایسی بات آتی ہے جو کلام کے اس دو طرفہ تقاضے کو پورا کر سکے۔ قرآن مجید نے ایسے مواقع پر دو صورتیں اختیار کی ہیں۔ یا تو جواب میں اثبات وانکار دونوں کے پہلو جمع کر دیے ہیں۔ مثلاً قسم کھائی فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے) پھر جواب میں فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الحاقة)

بے شک یہ ایک باعزت رسول کا قول ہے (یہ اثبات کا پہلو ہوا) اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ تم کمتر ایمان لانے والے ہو اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے تم کمتر یاددہانی حاصل کرتے ہو (یہ انکار کا پہلو ہوا) پروردگار عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔

دیکھو یہاں جس طرح انکار مکرر ہے اسی طرح اثبات بھی مکرر ہے۔

یا دونوں کو حذف کر دیا ہے اور سلسلۂ کلام کی کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو مقسم علیہ کو نمایاں کر رہی ہے یا موقع کلام اس قدر واضح اور غیر مشتبہ ہے کہ مقسم علیہ آپ سے آپ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً:

صٓ، وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ۔

ص، شاہد ہے یاد دہانی بخشنے والا قرآن، بلکہ کافر گھمنڈ اور جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں مقسم علیہ لفظوں میں مذکور نہیں ہے لیکن کلام کا اسلوب ایسا ہے کہ صاحب نظر پہلی ہی نظر میں اس کو پہچان لیتا ہے۔
اسی اصول پر سورۂ قیامہ کی آیت زیر بحث میں بھی مقسم علیہ کی پوری تصریح نہیں فرمائی ہے اور اس کے چند وجوہ ہیں۔

ا۔ بعد کی آیت اس کو خود بخود واضح کر رہی تھی۔

ب۔ یہاں مقسم بہ سے مقسم علیہ خود سمجھ میں آجاتا ہے۔

ج۔ زجر و توبیخ کا اسلوب بھی، جیسا کہ ہم چوتھی فصل میں بیان کر چکے ہیں، اصل معاملہ کو بے نقاب کر رہا ہے۔

د۔ سابق سورہ بھی، جیسا کہ ہم نے فصل اول میں بیان کیا ہے، مقسم علیہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۶۔ سورہ کے باقی تمام الفاظ بالکل واضح ہیں۔ شاید دو لفظوں کے متعلق تمہارے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو۔

معاذیر اور فاقرہ

"معاذیر" معذرۃ کی جمع ہے۔ اس کی اصل معاذر ہے۔ عربی زبان کی مشہور مثل ہے المعاذر مکاذب" معاذیر میں "ی" زیادہ ہوگئی ہے، جیسے مناکیر میں۔ میرے نزدیک لفظ کی صحیح اور واضح تحقیق یہی ہے اور یہ موقع کلام سے بھی پوری مناسبت رکھتی ہے۔ بعضوں نے اس کو معذار کی جمع بتایا ہے جس کے معنی اہل یمن کی بولی میں پردہ کے آتے ہیں، ہم کو اس سے اتفاق نہیں۔ آیت کی تاویل کے ذیل میں اس کے وجوہ معلوم ہو جائیں گے۔

'فاقرہ' آفت اور مصیبت کے اسماء میں سے ہے۔ گویا وہ ایسی سخت، و شدید آفت ہوگی کہ پشت کی ہڈیاں کو توڑ دے گی۔ لفظ قارعۃ کی بھی یہی نوعیت ہے۔ آفت و مصیبت، کی تعبیر کے لیے عربی میں جو اسماء ہیں وہ قیامت کے لیے استعمال ہوتے ہیں کیونکہ سب سے بڑی مصیبت یہی ہے۔

۷۔ یہاں جو قیامت کی قسم کھائی ہے تو اس میں جھڑکی اور تہدید کی انتہائی شدت پیدا ہوگئی ہے۔ گویا کلام کا خشمگین تیور خود پکار رہا ہے کہ یہ کیوں جلدی مچائے ہوتے ہیں۔ وہ ہولناک ساعت آرہی ہے جو ان کے سامنے معاملہ کی تمام حقیقت خود بالکل بے نقاب کر کے رکھ دے گی۔ ٹھیک اسی کے مماثل کلام دوسری جگہ وارد ہے فرمایا: وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (یوم موعود کی قسم) یہ قسم بھی اسی قہر و غضب کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جو الفاظ فرمائے ہیں ان میں لہجہ کی شدت پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔ فرمایا قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (کھڈوں والے لوگ تباہ ہوں)

جو لوگ جلدی مچائے ہوئے ہوں ان کو مخاطب کرنے کے لیے یہ اسلوب کلام سب سے زیادہ بلیغ اور موثر و دلنشین ہے اور قرآن مجید نے ایسے مواقع پر بالعموم یہی انداز تخاطب اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ لَیْسَ لِوَقْعَتِھَا کَاذِبَۃٌ (جب کہ واقع ہوگی واقع ہونے والی اور اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں)

بہ قسم، اقسام قسم میں سے ایک مخصوص نوعیت و حالت رکھتی ہے۔ یہ ایک شے کو خود اس کے اوپر بطور شہادت پیش کرنا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ بات، اس قدر واضح، اس قدر کھلی ہوئی اور اس قدر معلوم و معروف ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود دعویٰ ہے اور خود دلیل، خود شاہد ہے اور خود مشہود۔ اس اسلوب کا ایک قیمتی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے صبر کی اور فرصت کی قدر و قیمت کی تعلیم ملتی ہے۔ وہ جلدی مچائے ہوئے ہیں کہ اس دن کو معلوم کر لیں جس دن ان پر عذاب آئے گا، لیکن جواب میں اس دن کے بجائے ان کی وہ حالت بتائی جاتی ہے جو اس ہولناک دن کے آنے کے بعد ہوگی۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ موقع صبر کرنے اور انتظار اور مہلت سے فائدہ اٹھانے کا ہے، جلد بازی اور بے صبری کا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایسے مواقع پر اکثر فرمایا جاتا ہے کہ ان سے اعراض کرو، اور ان کو مہلت دو۔

اس معاملہ کے اندر ایک نہایت اہم نفسیاتی حقیقت بھی چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ جسم اور روح کے امراض میں ایک نہایت گہری مماثلت ہے جس طرح جسم کے امراض کا علاج ان کے اضداد سے ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کے امراض میں بھی اضداد ہی کا نسخہ کارگر ہے۔ پس جو نفس جلد باز اور بے صبرا ہے اس کے لیے سب سے زیادہ کارگر اور نفع بخش نسخہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ صبر اور انتظار کی کڑیاں جھیلے۔ قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے:

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْکٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَہٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰہِ ذِی الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا اِنَّھُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰىہُ قَرِیْبًا (المعارج)

مطالبہ کیا مطالبہ کرنے والوں نے واقع ہونے والے عذاب کا۔ وہ کافروں کے لیے ہوگا۔ کوئی نہیں جو اس کو ٹال سکے۔ مدارج والے خداوند کی طرف سے۔ فرشتے اور جبریل اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پس صبر کرو خوبصورتی کے ساتھ۔ وہ اس کو دور خیال کرتے ہیں اور ہم اس کو قریب دیکھتے ہیں۔

دیکھو یہاں سائل کا جواب نہیں دیا بلکہ آنحضرت صلعم کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی۔
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھڑکی اور دھمکی اور تہدید و تخویف کے بعد دلیل و حجت بیان کی جاتی ہے اور اس کے شواہد بھی قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً فرمایا۔

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ۔

کس چیز کی ان میں پوچھ گچھ ہو رہی ہے؟ اس بڑی خبر کی جس میں کوئی کچھ کہہ رہا ہے، کوئی کچھ۔ کچھ نہیں ابھی انھیں معلوم ہو جائے گا۔ ہاں کچھ نہیں، ابھی انھیں معلوم ہو جائے گا۔

یہاں تک تمام تر زجر و تنبیہ اور تہدید و تخویف ہے۔ اس کے بعد دلیل نمودار ہوتی ہے اور اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِھٰدًا سے کر اَلْفَافًا تک تمام دلائل قیامت بیان ہوتے ہیں (دیکھو سورہ کی تفسیر[1]) اسی سے ملتا جلتا اسلوب زیر بحث سورہ

---

[1] سورہ نبا کی تفسیر اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

میں بھی اختیار فرمایا ہے۔ پہلے بطور تہدید و تخویف قیامت کی قسم کھائی۔ اس کے بعد قیامت کی ایک ایسی دلیل بیان فرمائی جو اس کی سب سے زیادہ واضح اور قریبی دلیل ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہاں چند لفظوں میں اس کی تشریح کر دیں۔

۸۔ یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے ساتھ نفس لوامہ کی قسم کھائی ہے یعنی ہمارے نفس کو خود ہمارے نفس کے خلاف شہادت میں پیش کیا ہے۔ نفس لوامہ کو شہادت میں پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نفس پورے یقین کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ ایک ذمہ داری کے بوجھ سے گرانبار ہے اس پر ایک حاکم ہے جو اس کا محاسبہ کرے گا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض کام جو ہم کرتے ہیں اس پر ہمارا نفس ہم کو ملامت کرتا ہے۔ یہ حالت تو اس بات پر کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جزا اور محاسبہ کا ایک دن ضرور پیش آنے والا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی اس سے واضح ہوتی ہے کہ انسان کے نفس کے اندر ایک باطنی واعظ اور ایک اندرونی ناصح کی بولتی ہوئی زبان موجود ہے جو غلطیوں اور برائیوں پر اس کو برابر ٹوکتی اور نصیحت کرتی رہتی ہے تاکہ نفس خود اپنی ہی آواز پر چل کر راضی خوشی اللہ کی جماعت میں داخل ہو جائے اور اس کے اندر انکار و سرکشی کا کوئی داعیہ نہ ابھرنے پائے۔ یہی باطنی حس ہے جس کو قرآن نے 'بصیرت' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ اور پھر تعجب کیا ہے کہ اس بصیرت کے ہوتے ہوئے وہ جزا کا انکار کس طرح کر سکتا ہے؟ اس کا انکار اگر وہ کر سکتا ہے تو صرف اس صورت میں کر سکتا ہے کہ وہ سرے سے خدا کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہونے کا انکار کر بیٹھے۔ لیکن یہ انکار نہ صرف ایک انتہائی درجہ کی معصیت ہے بلکہ ایک سخت و شدید قسم کی حماقت بھی ہے۔ اور یقیناً یہی معصیت و حماقت داعی ہوئی کہ سرکش انسان اس سے بھی بڑی معصیت کا ارتکاب کرے، یعنی خدا کی قدرت کا انکار خود خدا کے سامنے کرے اور شک کی وہ بیماری جو اس کے دل کے اندر چھپی ہوئی ہے اس کو پوری رعونت اور پورے گھمنڈ کے ساتھ قیامت اور روز جزا کے مذاق کی صورت میں ظاہر کرے۔

۹۔ جس طرح شہادت میں قیامت اور نفس لوامہ دونوں کو ساتھ ساتھ پیش کیا ہے اسی طرح آگے چل کر قیامت اور نفس لوامہ کے صفات بھی ایک ہی ذیل میں بیان کیے ہیں۔ نفس لوامہ کی صفت بصیرت بیان فرمائی ہے اور بصیرت کا ناقابل انکار ہونا اس امر سے ثابت کیا ہے کہ انسان اپنے جرائم پر اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے کتنے ہی بہانے اور حیلے گڑھے لیکن وہ کسی طرح بھی اس کو مطمئن نہیں کر پاتا۔ دل کے پردوں میں کوئی چھپی ہوئی زبان برابر اس کو ٹوکتی اور سرزنش کرتی ہی رہتی ہے اور اندر سے ملامت کی ٹیس برابر اٹھتی ہی رہتی ہے۔ اس خلش سے اس کو چھٹکارا صرف اسی صورت میں ملتا ہے جب اس کی بدنفسی اس حد تک بڑھ جائے کہ اس کے اعمال کی سیاہی اس کے قلب کا احاطہ کر کے اس کو بالکل اندھا بہرا کر دے اور اس میں نیک و بد کے امتیاز کے لیے کوئی روشنی سرے سے باقی ہی نہ رہ جائے۔ نفس انسانی کی شقاوت کی یہ آخری حد ہے جس کے بعد اصلاح کی تمام امیدوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان پر وہ حالت طاری ہو جاتی ہے جس کو قرآن مجید نے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ یعنی دلوں پر مہر کر دینے کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ اور اندھوں کی یہی وہ بدبخت جماعت ہے جس سے اعراض کرنے اور درگزر کرنے کا آنحضرت صلعم کو قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ذٰلِکَ مَبْلَغُہُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔

پس جنھوں نے ہمارے ذکر سے منہ موڑا اور جو صرف دنیا کی زندگی ہی پر قانع ہو گئے ان سے اعراض کرو۔ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔

چنانچہ اس سورہ میں بھی جب اس جماعت کا ذکر ہوا تو ان سے اعراض کا حکم دیا گیا جیسا کہ ہم آگے "لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ" کی تفسیر کرتے ہوئے کھولیں گے۔

۱۰۔ قیامت اور نفس لوامہ کا ذکر ایک ساتھ آنے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان دونوں میں کوئی گہرا معنوی ربط ہے، چنانچہ غور و تدبر سے بعض نہایت لطیف حقائق روشنی میں آتے ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

قیامت نفس کلی کے لیے بمنزلہ لوامہ کے ہے۔ اس اجمال کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔ یہ عالم جو دیکھنے میں ہم کو نہایت پریشان اور بکھرا ہوا نظر آتا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہایت ہم آہنگ اور مربوط ہے۔ اس کے تمام اجزا میں ایک نہایت اعلیٰ ترتیب ہے، جو ان سب کو ایک رشتہ میں جوڑ کر ان کو ایک حسین وحدت کے قالب میں ڈھالتی ہے۔ جس طرح ایک انسان کا جسم اپنے اعضا و جوارح کے اختلاف کے باوجود ایک باطنی شیرازہ میں بندھی ہوئی وحدت ہے، ٹھیک ٹھیک یہی حال اس مجموعۂ کائنات کا بھی ہے۔ یہ عالم اپنی وحدت اور اپنی ہم آہنگی کے اعتبار سے بمنزلہ ایک شخص کے ہے اور جس طرح ہر انسان کے اندر اس کے افعال پر ملامت کرنے کے لیے ایک نفس لوامہ ہوتا ہے، اسی طرح اس عالم کے احوال و معاملات پر ملامت کرنے کے لیے بھی ایک نفس لوامہ ہے اور یہی نفس لوامہ ہے جس میں اس عالم کی صلاح و فلاح کی تمام روح پوشیدہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سارا نظام کائنات ظلم و عدوان اور شرارت و معصیت کے ہاتھوں برباد ہو کے رہ جائے۔ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ یہ دنیا بگڑ بگڑ کے بنتی اور اجڑ اجڑ کے بستی ہے تو یہ سب اسی مشاطۂ جمال یعنی نفس لوامہ کی کارفرمائی ہے۔ اس دنیا کا شیرازہ بارہا بکھرا اور مجتمع ہوا، یہ اپنے مرکز سے بارہا ہٹی اور صحیح راہ پر لگ گئی، کتنی بار ہم نے دیکھا کہ اس کے تمام اجرام باہم ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے مگر ایک مخفی ہاتھ بادلوں میں چھپا ہوا گویا اس بات کا منتظر ہی تھا کہ یہ زلف الجھے اور وہ اس کو سلجھا دے۔ چنانچہ یہ کل جب جب بگڑی اس نے ہر بار اس کے کل پرزوں کو ٹھیا یا اور اس کو بگڑنے سے بچا لیا۔ یہ طویل بحث ہے جس پر یہاں پھیل کر گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن اہل نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کائنات کے اندر اصلاح و درستگی کی ایک مخفی روح کارفرما ہے۔ اور یہ جو رات کے بعد دن کی تابانی، جاڑے کی خزاں سامانیوں کے بعد ربیع کی بہار آفرینی، قحط کی خشکی و یبوست کے بعد ابر و باد کی تردستیوں کے جلوے ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، ان سب میں اس شاہد مستور کے عجائب اور کرشمے ہم دیکھتے ہیں۔

یہ تغیرات اس مادی دنیا پر طاری ہوتے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک اسی قسم کے تغیرات اس دنیا کے اخلاقی عالم میں بھی نمودار ہوتے ہیں۔ اس میں بھی ہماری مادی دنیا کی ربیع و خریف کی طرح بہار و خزاں کی نیرنگیاں نمودار ہوتی ہیں۔ البتہ دونوں کی شکلوں میں کسی قدر فرق ہوتا ہے اور ان کے نام بھی ایک دوسرے سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ مادی دنیا میں بہار آتی ہے تو کہتے ہیں کہ خشکی و ویرانی کے بعد سرسبزی و شادابی کا موسم آ گیا لیکن یہی چیز جب اخلاقی عالم میں

نمودار ہوتی ہے تو کہتے ہیں بدی کے بعد نیکی کا دورِ سعادت آگیا؛ ظلم و جور کی ظلمت کے بعد اخلاق اور انسانیت کی صبح طلوع ہوئی۔

یہ چند اجمالی اشارات ہیں ان کی تفصیل سورۂ اعلیٰ کی تفسیر میں ملے گی۔

الغرض قیامت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کائنات کے نفس کلی کے لیے بمنزلہ لوامہ کے ہے، چنانچہ دیکھو کہ قیامت، اور وہ نفس لوامہ، جو ہم میں سے ہر شخص کے اندر موجود ہے اور جو گویا ہمارے عالم باطن کے اندر قیامت کی ایک مثال یعنی قیامت صغریٰ ہے۔ اپنی خصوصیات و صفات میں دونوں بالکل یکساں ہیں۔ قیامت نفس کلی کے لیے لوامہ ہے یعنی جو کچھ اس نے کیا ہے وہ سب ایک روز ان کے سامنے رکھ دے گی۔

يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ۔ — انسان اس دن جان لے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا۔

اور بعینہ یہی حال ہمارے اندر کے نفس لوامہ کا ہے۔ وہ بھی ہمارے سامنے ہمارے اعمال کی اصل حقیقت رکھ دیتا ہے۔

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ۔ — بلکہ انسان اپنے نفس پر خود بصیرت ہے۔

اس سمٹے ہوئے نقطہ کو ذرا اور پھیلا کر غور کرو تو یہ بات بھی تم پر روشن ہو جائے گی کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کے لیے بمنزلہ نفس لوامہ کے ہوتا ہے اور خاتم الانبیا حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت چونکہ تمام دنیا کے لیے ہوئی ہے اس وجہ سے آپ تمام بنی آدم کے لیے نفس لوامہ ہیں۔ اور اس اعتبار سے گویا آپ قیامت اور دینونت عالم کی مثال ہیں۔ اس نکتہ کو ہم نے اپنی کتاب ملکوت اللہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور کسی قدر سورۂ صف کی تفسیر میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۱۔ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ سے لے کر وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ تک کی تفسیر ایک حد تک بیان ہو چکی، اور تیسری فصل میں ہم نے کلام کے اصلی پہلو کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ اب ہم ان آیات کے مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کی اس ہیئت کی تصویر کھینچی ہے جو اس کے ظہور کے دن لوگوں کے سامنے آئے گی اور جو نگاہوں کو خیرہ کر دے گی اور جس کی ہولناکی اور وحشت تمام سرگشتگان غفلت کو جھنجھوڑ کر جگا دے گی، رہے یہ سوالات کہ چاند کس طرح گہنائے گا؟ یا سورج اور چاند کس طرح یکجا ہو جائیں گے تو ان کی نسبت ہم اپنی کتاب المتشابہات میں لکھ چکے ہیں کہ قیامت کے احوال و معاملات، دنیا کے عام احوال و معاملات کی طرح نہیں ہیں کہ ہم اپنی دنیا کے قوانین و ضوابط پر ان کو ٹھیک ٹھیک تول سکیں۔ ان کے ذکر کا اصلی مقصد عبرت و تنبیہ ہے اور اس مقصد کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کی اصلی نوعیت و کیفیت کی تلاش میں سرگرداں ہوں، بلکہ بعض اعتبارات سے ان کی اصلی کیفیت کے پوشیدہ ہونے ہی میں عبرت و تنبیہ زیادہ ہے۔ اس بارہ میں اہل ایمان و یقین کی راہ یہی ہے۔ رہے منکرین اور اہل شک تو ان کے شبہات کا جواب دینے کا مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ قیامت کے ان احوال و واقعات

کی مناسبت اور مشابہت قدرت کے ان عام احوال و معاملات سے واضح کر دی جائے جن سے وہ واقف ہیں۔ لیکن اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یہ محض ایک قسم کی مشابہت کا اظہار ہوگا۔ یہ سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ قیامت کے احوال ٹھیک ٹھیک یونہی یا اسی طرح پیش آئیں گے۔ ان سے مقصود صرف یہ دکھانا ہوگا کہ تمہارے جانے بوجھے واقعات فطرت کی روشنی میں قیامت میں پیش آنے والے واقعات کو مستبعد نہیں کہا جا سکتا۔

مثلاً ایک منکر کے سامنے اس آیت کے متعلق ہم یوں تقریر کر سکتے ہیں کہ تم تسلیم کرتے ہو کہ اجسام کی حرارت، اگر ان کا ماحول ان سے زیادہ ٹھنڈا ہو، آہستہ آہستہ گھٹ جاتی ہے۔ اسی طرح تم یہ بھی مانتے ہو کہ اجسام درجہ بدرجہ شدید حرارت اور ہوائیت کے درجہ سے سیلان اور پھر برودت اور جمود کی حالت کو پہنچے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ بہت سے اجرام سورج کی طرف جذب ہو کر اس میں جا پڑے ہیں۔ اگر یہ تمام باتیں تمہارے نزدیک ثابت اور صحیح ہیں تو پھر تم کو اس کے باور کرنے میں کیوں شک ہے کہ ایک دن چاند اور ہمارا یہ کرۂ زمین دونوں سورج کی طرف کھنچ جائیں گے اور چونکہ سورج کی حرارت اس وقت کم ہو جائے گی اس وجہ سے باوجود سورج سے قرب کے انسان زندہ تو رہ سکے گا لیکن اس کی روشنی سے اس کی نگاہیں خیرہ ہوں گی۔ اسی طرح چاند پہلے تو گہنا جائے گا کیونکہ کرۂ زمین کے سورج کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے چاند کی روشنی جاتی رہے گی۔ اور پھر وہ سورج کے اندر جا پڑے گا۔ چنانچہ حضرت قتادہؓ اور حضرت حسنؒ سے مروی ہے کہ ”خسف قمر“ کے معنی یہ ہیں اس کی روشنی جاتی رہے گی اور پھر آخر میں وہ سورج میں جا پڑے گا۔“ یہ بات ”خسف“ کے اصلی مفہوم سے جو قرآن کی متعدد آیات سے ثابت ہے نہایت قریب ہے مثلاً قارون کے قصہ میں ہے کہ فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ (پس ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا) اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس وقت چاند اپنے مدار سے ہٹ جائے گا۔

یہ سب باتیں قیامت کے قریب پیش آئیں گی، رہا آج کا معاملہ تو آج یہ نظام مضبوطی، باقاعدگی اور خوب صورتی کی تمام خوبیوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ تمام اجرام اپنے اپنے دائرہ کے اندر گردش کر رہے ہیں اور قدرت نے جو مقاصد و مصالح ان سے وابستہ کر رکھے ہیں ان کو بہتر سے بہتر طریقہ پر پورا کر رہے ہیں۔

وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (یٰسین)

اور ان کے لیے نشانی ہے رات اس سے ہم کھینچ لیتے ہیں دن کو تو دفعتہً وہ تاریکی میں ہو جاتے ہیں۔ اور سورج اپنے ایک مدار پر گردش کرتا ہے، یہ ایک عزیز و علیم کا کارخانہ ہے، اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں یہاں تک کہ وہ ہو جاتا ہے کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح۔ نہ سورج کو حق ہے کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ شب دن پر سبقت کرتی ہے اور سب الگ الگ افلاک میں تیر رہے ہیں۔

یعنی دن کے چھپ جانے، سورج کے ایک ٹھہرائے ہوئے مستقر پر گردش کرنے، اور چاند کے گھٹنے بڑھنے میں اس بات

کی نہایت واضح دلیل موجود ہے کہ ایک دن یہ نظام ختم ہو جائے گا۔

پھر دیکھو سورج اور چاند دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں لیکن کبھی نہیں ہوتا کہ سورج چاند کو جا پکڑے اور نہ زمین کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ سورج سے بھاگ جائے کہ سورج کی روشنی زمین کی شب کو پا ہی نہ سکے بلکہ یہ تمام اجرام بغیر کسی بدنظمی اور خلل کے اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں اور اس امر پر روشن دلیل ہیں کہ جو غیر مرئی ہاتھ تمام کارخانۂ خلق پر اس طرح حاکم و متصرف ہے وہ ضرور اس بات پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے اس کارخانہ کو درہم برہم کر دے۔ اور یقیناً وہی ذات ...... سب کا مرکز و مرجع ہے۔

پس ایک وقت آئے گا کہ چاند سورج میں جا پڑے گا اور لوگوں کو محسوس ہوگا کہ سورج قریب آرہا ہے اور قریب ہے کہ زمین بھی اس میں جھونک دی جائے۔ اور یہ دیکھ کر گھبرا کر بھاگنا چاہیں گے لیکن بھاگنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے تو اس وقت پکاریں گے اَیْنَ الْمَفَرُّ (اب کہاں بھاگوں؟) یہاں ان مختصراً اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، آگے انشاء اللہ ان آیات پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

۱۲- ابتدائے نبوت میں قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ قرآن مجید کے مخاطب تھے اولاً تو ان کی استعداد خام تھی ثانیاً وہ نہایت بدشوق بلکہ قرآن سے بیزار تھے۔ ایسی حالت میں حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوا کہ ان کی تعلیم آہستگی، تدریج اور نرمی کے ساتھ ہو۔ چنانچہ ہر سبق کے بعد ان کو کچھ مہلت دی جاتی تھی کہ ان کی نفرت و بیزاری کم ہو جائے تا کہ ان کے سامنے کوئی نئی تعلیم پیش کی جائے لیکن یہی معاملہ جو قرآن کے بدشوق اور بیزار مخاطبوں کے لیے ضروری تھا۔ کبھی کبھی جب یہ وقفہ مہلت کچھ دراز ہو جاتا تو آنحضرت صلعم کے لیے موجب تشویش بن جاتا اس لیے کہ آپ کا تمام تر سرمایہ تسکین و اطمینان قرآن ہی تھا۔ مخالفتوں کے ہجوم اور عداوتوں کے طوفان میں یہی چیز تھی جو آپ کو ڈھارس بندھاتی اور دل کو مرکزِ حق پر ثابت قدم اور استوار رکھتی۔ اس وجہ سے جب کبھی بھی رحمتِ الٰہی کی یہ روح پرور اور حیات بخش بارش کچھ طویل وقفہ کے لیے رک جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ نہال نبوت پر سموم کا کوئی جھونکا آگیا ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی اسباب تھے جن کی وجہ سے یہ وقفہ کا زمانہ آپ پر نہایت شاق گزرتا تھا۔ مثلاً آپ اپنی قوم کے ایمان کی بے پایاں آرزو رکھتے تھے اور اس آرزو کے پورے ہونے کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہی تھی۔ پھر آپ کو تکمیلِ دین کی تمنا تھی اور تمنا قدرتاً جلد باز ہوتی ہے۔ نیز کفار ازراہِ اعتراض کہتے تھے کہ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً (ان پر پورا کا پورا قرآن آخر ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیا جاتا) ان سب باتوں کی وجہ سے نزولِ وحی کے وقت آپ کا جذبۂ شوق، و طلب بہت زیادہ بڑھ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ وحی کو زبان سے دہراتے کہ کوئی بات یاد ہونے سے رہ نہ جائے۔ آپ کی خواہش یہ ہوتی کہ جو سبق آپ کو دیا گیا ہے اس کو جلدی سے جلدی یاد کر لیں تا کہ نیا سبق حاصل کرنے کا حق حاصل کر لیں جو اطمینانِ قلب کا سرمایہ، قوت کا ذریعہ اور احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا وسیلہ بن سکے۔

آنحضرت صلعم کی اس حالت پر لسانِ غیب نے آپ کو بار بار ٹوکا اور خداوندی امور میں مہلت اور تدریج کا جو معاملہ ہے اس کی حکمتیں متعدد آیات میں بیان فرمائیں، مثلاً فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ ۲۰: ۱۱۴-۱۱۵)

اور قرآن کے معاملہ میں وحی تمام ہونے سے پہلے جلدی نہ کرو اور دعا کرو کہ اے پروردگار میرے علم میں افزونی فرما اور ہم نے آدم سے ایک عہد لیا اس سے پہلے پھر وہ اس کو بھول بیٹھا اور ہم نے اس میں پختگی نہیں پائی۔

یعنی انسان عہد اور ارادہ کا بودا ہے، پوری شریعت کا بار گراں اگر ایک ہی دفعہ اس پر ڈال دیا جائے تو وہ ہمت چھوڑ بیٹھے گا۔ اس وجہ سے اس بات کے لیے جلدی نہ کرو کہ پورا قرآن بیک وقت اتار دیا جائے جتنا ملتا ہے اس کو لے لو اور منتظر رہو کہ ابھی اس کو تخفیف و تکمیل کے بہت سے مراحل سے گزرنا باقی ہے۔ البتہ اپنے پروردگار سے علم کی زیادتی کے لیے دعا کرتے رہو۔ پس اس آیت میں اجمال کے ساتھ تدریج کی حکمت بیان فرما دی ہے کہ یہ تدریج انسان کے عزم کی کمزوری اور اس کے ارادہ کی ناپائیداری کے سبب سے اختیار کی گئی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ایک دفعہ میں اس کو سب کچھ دے دیا جاتا۔

اسی حقیقت کو اس سورہ کی آیت لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (نہ چلا اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو کہ جلدی سیکھ لے۔ ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا۔ پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کر۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی تفصیل۔ کچھ نہیں۔ بلکہ تم دنیا کو چاہتے ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو) میں بیان فرمایا۔ لیکن اس میں انسانی فطرت کے ایک دوسرے گوشہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سورہ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت میں تدریج کی حکمت انسان کے ارادہ کی کمزوری اور اس کے عزم کے بودے پن کے پہلو سے واضح کی تھی۔ اس میں تدریج کی حکمت ایک اور پہلو سے بھی بیان فرمائی ہے۔ یہ پہلو انسان کی قبولِ تربیت کی صلاحیت و استعداد کا پہلو ہے۔ یہ بات کسی قدر باریک ہے۔ اس کی وضاحت سے سمجھ لو کہ دونوں کا فرق بھی واضح ہو جائے اور اصل معاملہ بھی روشنی میں آجائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں بصیرت و تمیز کی ایک روشنی رکھی ہے اور ساتھ ہی اس میں بلندی اور رفعت کا ولولہ بھی ودیعت فرمایا ہے۔ اس ولولہ کی تحریک اور اس روشنی کی رہنمائی قدرتاً اس کو درجہ بدرجہ بلندیوں ہی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ لیکن اس راہ میں اس کو دنیوی زخارف اور لذات و شہوات سے بھی کشاکش کرنی پڑتی ہے۔ یہ زخارف و شہوات اپنے ساتھ نفع عاجل کی کشش بھی رکھتے ہیں، اور یہ نفع عاجل وہ شے ہے جو انسان کی فطرت میں اسی طرح ودیعت ہے جس طرح بلندی اور رفعت کا جذبہ۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انسان عجلت کے خمیر سے بنا ہے) دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (انسان تھڑدلا پیدا ہوا ہے۔ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے گھبرا اٹھتا ہے

اور جب اس کو نعمت ملتی ہے تو اس کو سینت کر رکھتا ہے۔ بس نماز پڑھنے والے اس سے مستثنیٰ ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو الہ اس لیے بنایا کہ اس کی آزمائش کے لیے ایسا بنانا ضروری تھا تاکہ یہ کشاکش کھوٹے اور کھرے کی پہچان کا ذریعہ بنے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان دو متضاد قسم کے جذبات کی کش مکش کے اندر پیدا کیا گیا ہے۔ ایک جذبہ اس کو بلند عزائم اور بلند کاموں کی طرف کھینچتا ہے اور دوسرا جذبہ اس کو دنیوی سروسامان اور دنیوی لذتوں کی طرف کھینچتا ہے اور یہ دونوں جذبے اس میں یکساں ودیعت ہیں۔ انہی دونوں جذبوں کی کشاکش اس کی تمام سرگرمیوں کا سرچشمہ ہے۔ اور پھر انھیں موجوں کے تلاطم کے اندر اس کی فطرت کا گہر تربیت پاتا ہے۔ تم پوچھوگے ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس لیے ہوا تاکہ فطرت کا تخم خود ان قوتوں کی رضاعت اور تربیت سے بڑھے اور پھلے پھولے جو اس کی ذات کے اندر موجود ہیں۔ وہ اپنے سے باہر کے موسموں اور فصلوں کا محتاج نہ رہے۔ چنانچہ یہی راز ہے کہ معاملۂ دین میں جبر و اکراہ بالکل ممنوع ہے۔

اب مطالب کی ترتیب گویا اس طرح ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ہم نے انسان میں ایک نفس لوامہ رکھا ہے اور جزا پر اس کا عقیدہ مضبوط کرنے کے لیے اس کے اندر ایک بصیرت ودیعت کی ہے۔ اس کے بعد پیغمبر صلعم کو لوگوں کو تربیت کرنے کا ڈھنگ بتایا کہ قرآن کے لیے جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ تربیت میں تدریج کا لحاظ رکھنا ہمارا ابدی قانون ہے۔ اسی قانون کے مطابق ان کی اصلاح و تربیت کا معاملہ انجام پائے گا۔ اصلی مربی تو ہم ہیں، تمہارا فریضہ تو ہمارے حسب منشا احکام و آیات کا پہنچا دینا ہے۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یہ نہیں ہے کہ تم جس کو چاہو ہدایت دے دو بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت دے گا (اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں)

اس کے بعد پیغمبر صلعم کو تسلی دی کہ یہ جو علیحدہ علیحدہ قرآن مجید نازل ہو رہا ہے تو اس کو ایک دن ہم جمع کریں گے اور اس کی ذمہ داری بھی ہمارے ہی اوپر ہے۔ پھر ہم اس کی اصلی ترتیب کے مطابق اس کو سنائیں گے اور جہاں جہاں تشریح و بیان کی حاجت ہوگی وہاں توضیحی آیات کے ذریعہ سے اس کی تشریح و تفصیل کر دیں گے (اس مسئلہ کے متعلق تفصیلی مباحث ہماری کتاب تاریخ القرآن[1] میں ملیں گے)

پھر یہ واضح فرمایا کہ ان لوگوں کا قرآن مجید سے اعراض اس سبب سے نہیں ہے کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر نازل ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کے نزول کے لیے تو سب سے زیادہ موزوں اور موافق حکمت و مصلحت طریقہ یہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا پر ریجھے ہوئے اور آخرت سے بے پروا ہیں۔ وہ صرف ظواہر اور محسوسات کے غلام ہیں اور غیب کے پردوں میں جو کچھ ہے اس سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انسان اپنے دل کے اندر خود بصیرت کی آنکھیں رکھتا ہے، جو ان حقائق کو دیکھ سکتی ہیں جو محسوسات سے ماوراء ہیں لیکن انسان بالقصد آنکھیں بند کرتا اور اندھا بنتا ہے اور یہ اس کے کفر و تمرد کی سیاہی ہے جو اس پر چھا گئی ہے، ورنہ ایمان و ہدایت کی تمام راہیں تو اس کے سامنے کھول کر رکھ دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹھیک راستہ کی ہدایت بھی فرما دی ہے اور ٹھیک راستہ کی پہچان کے لیے علامتیں اور نشانیاں بھی بتا دی ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ ایک مرتبہ یہ سب بتا کر ہمیشہ کے لیے پھر بتانے

---

[1] مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس نام سے بھی ایک کتاب لکھنی چاہی تھی لیکن کچھ متفرق فصلوں سے زیادہ اس کو نہ لکھ سکے (مترجم)

کا دروازہ بند کر دیا گیا ہو بلکہ آفاق و انفس کے اندر برابر وہ اپنی نشانیاں اور اپنے عجائب دکھاتا رہتا ہے۔ نیز قرآن کے شروع ہی میں بیان فرما دیا ہے کہ اس کی ہدایت انہی لوگوں کو نصیب ہوگی جو غیب میں رہتے ہوئے ایمان لائیں گے اور صرف محسوسات ظاہری ہی کے غلام بن کر نہ رہ جائیں گے۔ اس وجہ سے اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ کہ ان پر نصیحت کی تمام باتیں بیک وقت اتار دی جائیں۔ بس نصیحت کرتے رہو اور جب یہ شرارت کریں تو درگزر کرو۔ تبلیغ و دعوت کی راہ یہی ہے، جن دلوں میں قبول حق کی صلاحیت ہوگی وہ آپ سے آپ کھل جائیں گے۔ اس کی تمنا نہ کرو کہ پورا قرآن بالکل مرتب و مفصل ایک ہی مرتبہ میں اتار دیا جائے۔

یہ جو ہم نے کہا ہے بالکل یہی حالت قرآن میں ان کی بیان ہوئی ہے۔ فرمایا:

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۝ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ (مدثر- ۴۹-۵۲)

ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یاددہانی سے اعراض کر رہے ہیں، گویا بدکے ہوئے گدھے ہیں، جو بھاگے ہیں شیر سے بلکہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں۔

پھر ان کی اس خواہش کا جواب دیا۔

كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ (مدثر- ۵۳-۵۵)

ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے، ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے پس جو چاہے اس کو یاد کرے۔

اس میں واضح فرما دیا ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو ان کی خواہش کے مطابق آسمان سے کھلے ہوئے صحیفے اتار کے نہیں دیے جاتے بلکہ ان کی اصلی بیماری آخرت سے غفلت ہے۔ جب تک آنکھوں کے سامنے سے یہ پردہ نہ ہٹے گا اس وقت تک ان کے لیے ایمان لانا محال ہے۔

اگر آیات کے ربط و نظام کو پیش نظر رکھ کر غور کروگے تو یہ تاویل بالکل واضح معلوم ہوگی۔ بالکل اسی کے مماثل کلام دوسری جگہ ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ

ہم تجھے پڑھائیں گے پھر تو نہ بھولے گا، مگر ایسی ہی کچھ جو خدا چاہے۔ بے شک وہ جانتا ہے پکار کر ہو یا چھپا کر۔ اور ہم سہج کر دیں گے تجھ کو آرام دینے والی سو یاد دلا اگر یاد دلانا کچھ کام کرے، خیال کرے گا جسے ڈر ہوگا اور کنارے رہے گا محروم جو پڑے زور کی آگ میں پڑے گا پھر اس میں نہ مرے گا نہ جئے گا۔ کامیاب ہوا جو ستھرا رہا اور اپنے خداوند کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی پھر تم دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھتے ہو۔ حالانکہ آخرت کی زندگی

خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝ (الاعلیٰ ۶-۱۷)　　اس سے اچھی زیادہ رہنے والی ہے۔

ان آیات پر غور کرو، دونوں مقامات میں بالکل ایک ہی قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

اسی کے مماثل مضمون سورۂ دہر میں ہے۔ اس میں خود انسان کے وجود کو اس کے سامنے بطور حجت پیش کیا ہے کہ انسان بدیہی طور پر یہ جانتا ہے کہ پہلے وہ کچھ نہ تھا، پھر اس کو پروردگار نے پیدا کیا، اس کو دانا و بینا بنایا، اس کو نیکی اور بدی کی پہچان بخشی، اور اس کو اختیار دیا، چاہے وہ بندگی اور شکرگزاری کی راہ چلے، چاہے ناشکری اور بغاوت کی۔ پھر ان دونوں راہوں کے چلنے والوں کا انجام بیان کر دیا۔ اس کے بعد آنحضرت کو بطور تسکین و تسلی یہ تعلیم فرمائی کہ تمہارے اوپر ان کے ایمان و اسلام کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ قرآن ہم نے اتارا ہے اور ان کا فیصلہ ہمارے ہی اختیار میں ہے۔ تمہارے ذمہ صرف یہ حکم ہے کہ ہمارا حکم ان کو پہنچا دو اور اپنی دعوت پر جمے رہو۔ ان لوگوں کے مطالبات کا خیال نہ کرو جنھوں نے اپنی عقل و بصیرت بالکل ضائع کر دی ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو دوسرے مقامات میں قرآن نے درگزر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور مراحل نبوت میں یہی وہ نقطہ ہے جہاں پہنچ کر پیغمبر کو نماز اور اللہ کی طرف توجہ اور صبر کا حکم ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں اور ان میں سے بعض ہم سورۂ[1] دہر کی تفسیر میں پیش کریں گے۔

اس کے بعد ان کے اصل روگ کو بیان کر دیا کہ وہ حب دنیا میں گرفتار اور آخرت سے بیزار ہیں۔ پھر نہایت تصریح کے ساتھ فرمایا کہ ان کے ایمان لانے نہ لانے کی ذمہ داری سے تم سبکدوش ہو۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے اختیار میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اس نے تم پر یاددہانی اور نصیحت کے لیے ایک کتاب اتاری ہے، جو شخص اللہ کی راہ پکڑنا چاہے وہ اسی روشنی سے رہنمائی حاصل کرے۔

یہاں ہم نے مطالب کا حوالہ نہایت اجمال کے ساتھ دیا ہے۔ سورۂ دہر کی تفسیر میں پوری تفصیل ملے گی۔[1] وہاں دیکھو اور پھر ان دونوں سورتوں (قیامت اور دہر) کی مطابقت پر غور کرو۔ تمام حقیقت آئینہ ہو جائے گی۔ ع

این دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند

۱۳- چونکہ صحیح نظم کلام لوگوں کے سامنے نہیں تھا اس وجہ سے ہمارے مفسرین کو لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ کے خطاب و التفات کے سمجھنے میں بڑی حیرانیاں پیش آئیں۔ قفال رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ بات قیامت کے دن کافر کو مخاطب کر کے کہی جائے گی۔ دوسرے مفسرین کے اقوال اگرچہ اصل معنی سے ایک حد تک قریب ہیں تاہم اتنے پر تو تقریباً سب ہی متفق ہیں کہ یہ کلام بالکل مستقل ہے، سورہ کے مضمون سے اس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ ان حضرات نے بالعموم یہ سمجھا ہے کہ نزول وحی کے وقت آنحضرتؐ نے عجلت فرما دی تھی، جبریلؑ نے آپ کو اس جلدبازی سے روک دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کا نزول بہت حد تک بارش سے مشابہ تھا جس میں زمین کی ضرورت اور موسم کی طلبگاری کا بھی دخل ہوتا ہے۔ یہ بات اس وجہ سے تھی کہ قرآن کی تعلیمات حالات سے بالکل مطابق ہو سکیں۔ پس اس آیت کے نزول کے وقت یہ بات ضرور تھی کہ آنحضرت صلعم قوم کے ایمان کی تمنا میں وحی کے بہت منتظر تھے اور جب وحی نازل ہوئی

[1] سورہ دہر کی تفسیر مکمل نہ ہونے کی وجہ سے اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ (مترجم)

تو ایک پرشوق طالب کی طرح آپؐ نے اس کو سیکھنے میں عجلت فرمائی لیکن آپؐ کی یہ حالت کچھ اسی موقع کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ یہ آپ کی عام حالت تھی اور آپؐ کی اس عجلت پر اس طرح کے الفاظ میں بار بار آپؐ کو تسلی دی گئی ہے اور چونکہ آپؐ کے اس شوق کے اور آپؐ کی اس عجلت کے اسباب مختلف تھے اس وجہ سے تسلی بھی، جیساکہ اوپر بیان ہوا، مختلف پہلوؤں سے نازل ہوئی۔

مفسرین کا خیال ہے کہ اس سورہ میں جس عجلت کا ذکر ہے، اس کا سبب آنحضرت صلعم کا یہ اندیشہ تھا کہ مبادا قرآن کی کوئی بات ضائع ہو جائے۔ ہم کو اس خیال سے اختلاف نہیں ہے، یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل پنہاں ہے جس کو سمجھ لینا چاہیے۔

آنحضرت صلعم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپؐ محسوس کرتے کہ یہ ایک عظیم الشان ذمہ داری اور ایک بہت بڑی امانت ہے جو آپؐ کے سپرد کی جا رہی ہے، اگر اس میں کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی یا اس کا ایک نقطہ بھی ضائع ہوا تو آپؐ کو اس کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی آپؐ کو اس وحی کی زیادتی کی بھی تمنا تھی کہ شاید آپؐ کی قوم اس کے کسی حصہ کی برکت سے راہ یاب ہو جائے۔ معاملہ کے یہ دو پہلو نہایت واضح تھے چنانچہ آپؐ کو اس سورہ میں جو تسلی دی گئی ہے اس میں ان دونوں پہلوؤں کی پوری رعایت موجود ہے اور ساتھ ہی اس سورہ کے خاص رجحانات کا جو تقاضا تھا وہ بھی پورا ہو گیا ہے۔ یعنی اگر کلام کے تمام اجمالات و اشارات کھول دیے جائیں تو پوری بات گویا یوں ہو گی کہ ”وحی کے سیکھنے میں تم اس قدر محنت کیوں برداشت کر رہے ہو۔ قرآن کی حفاظت اور اس کے جمع کرنے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ رہا تمہاری قوم کی ہدایت کا معاملہ تو تمہاری قوم دنیا کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لیے وحی کی کمی اور بیشی دونوں یکساں ہے۔“

اس کے بعد فرمایا کہ ان پر حق اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ کوئی بات مخفی نہیں رہ گئی ہے۔ پھر ہدایت پانے والوں اور گمراہ ہونے والوں کا فرق بتا دیا۔

پس اس سورہ میں گویا ان امور کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو سورۂ اعلیٰ اور سورۂ دہر میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور جو امور ان دونوں سورتوں میں مجمل رہ گئے ہیں ان کی تفصیل اس میں آگئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس تفصیل کو کسی قدر اور واضح کر دیں کیونکہ اس کا تعلق ایک نہایت اہم مسئلہ سے ہے۔

۱۴- اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح متعدد آیات میں فرمایا ہے،

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ ۔ (حٰمٓ السجدۃ ۴۱-۴۲)　　یہ ایک کتاب عزیز ہے۔ باطل، نہ اس میں اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (الحجر-۹)　　بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر کو اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کسی کمی بیشی یا کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے کیونکہ یہ باتیں قرآن مجید کی حفاظت کے منافی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلم ہے کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے۔ نہ اس میں ایک نقطہ کا اضافہ ہوا ہے نہ ایک شوشہ کی کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ جو امامیہ کی نسبت مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علماء کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضٰی، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسیؒ، ابو علی طبرسی صاحب مجمع البیان، محمد بن علی بن بابویہ قمی سب نے اس لغو خیال کی پوری شدت کے ساتھ تردید کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں، "ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا بعینہ وہی قرآن ہے جو ما بین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ نفس قرآن مجید اس سے زیادہ ایک حرف نہیں تھا۔ جو شخص ہماری طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں وہ جھوٹا ہے۔" اس بارہ میں ان کے ہاں جو روایات ہیں ان کے متعلق سید مرتضٰی کہتے ہیں، "امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے، ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے، ان کے سارے اختلاف کا مدار اصحاب روایات کی چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ حضرات صحیح سمجھتے ہیں، حالانکہ ان روایات کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات سے انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت کے ساتھ معلوم ہے۔" سید مرتضٰی نے اس پر دوسری دلیلیں بھی قائم کی ہیں لیکن یہاں ہم ان کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہماری کتاب تاریخ القرآن میں تمام ضروری تفصیلات ملیں گی۔ یہاں ہم مسئلہ سے اسی حد تک بحث کرنا چاہتے ہیں جتنا سورہ کے اس مقام کی توضیح کے لیے ضروری ہے۔

آیت "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ[1]" سے تین باتیں نہایت واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ قرآن آنحضرت صلعم کے عہد میں جمع ہو کر ایک خاص ترتیب سے آپ کو سنا دیا جائے گا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قرأت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کر)

۲۔ آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد دوبارہ جس طرح آپ کو قرآن سنایا جائے اس طرح آپ اس کو پڑھیں۔ اور یہ بات عقلاً و نقلاً دونوں اعتبار سے بالکل غلط معلوم ہوتی ہے کہ آپ پر کوئی بات وحی کے ذریعہ سے آئے اور آپ اس کو امت کو نہ پہنچائیں۔ عقلاً تو اس کی غلطی بداہۃً واضح ہے کسی تفصیل کی ضرورت ہی نہیں۔ نقلاً یہ یوں غلط ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ	اے رسول جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر اتارا گیا
مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ	ہے اس کو پورا پورا پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے
رِسَالَتَهٗ (مائدہ)	(گویا) اس پیغام کو نہیں پہنچایا جو تم کو دیا گیا۔

[1] پھر ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کر۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی تفصیل۔

یہ ایک عام حکم ہے۔ اس حکم عام کا تقاضا ہے کہ آنحضرت صلعم نے امت کو اس ترتیب کے مطابق قرآن سنایا ہو جس ترتیب پر اس کی آخری قرأت ہوئی ہے اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہوگی جو لوح محفوظ میں ہے کیونکہ آخری قرأت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونا ضروری ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں بھی بیان فرما دیں جو تعمیم و تخصیص یا تخفیف و تکمیل سے تعلق رکھتی تھیں۔

یہ باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تصدیق روایات سے ہوتی ہے کہ یہ تمام باتیں ٹھیک ٹھیک پوری ہوئیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم قرآن مجید کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے تھے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ آپ کو وہ اس خاص ترتیب پر سنائی گئی ہوں۔ اور صحابہؓ نبی صلعم کی اس پیش کردہ ترتیب کے مطابق قرآن مجید کو سنتے اور محفوظ کرتے تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ خاص خاص آیتوں کو خاص خاص سورتوں میں خاص خاص مقامات میں لکھواتے تھے اور صحابہؓ اس کی پابندی فرماتے تھے۔ پھر جب کوئی توضیحی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو اصول ملحوظ رکھے جاتے یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملا دی جاتیں جن کی وہ تشریح کرتیں۔ یا سورہ کے آخر میں رکھ دی جاتیں، اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔

ان توضیحی آیتوں کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ خود ان آیتوں کے اندر ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ یہ آیتیں تشریح و توضیح کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً اس طرح کی آیات کے ساتھ اکثر فرمایا گیا ہے كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ (اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کو لوگوں کے لیے کھول دیتا ہے)

اس طرح جب قرآن نازل ہو چکا تو آخر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو پورا قرآن اس کی اصلی ترتیب کے مطابق سنا دیا۔ یہ بات صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے اور اس سے نظام قرآن کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو جاتی ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ نہایت اہم تھا اس وجہ سے ہم نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ نیز مقدمہ تفسیر میں بھی بعض ضروری امور کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اس لیے یہاں زیادہ پھیلانے کی ضرورت نہیں۔

۱۵۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ	کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے پروردگار
وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ اَنْ	کی رحمت کے منتظر۔ اور کتنے چہرے اداس ہوں گے، گمان
يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ	کریں گے کہ ان پر کمر توڑنے والی مصیبت ٹوٹے گی۔

یہ ماننے والوں اور جھٹلانے والوں کی تصویریں ہیں، اور دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل میں رکھا ہے تاکہ ان کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے۔ ایک گروہ تو وہ ہوگا جو رحمتِ الٰہی کی امیدوں سے ہشاش بشاش ہوگا، ان کے چہرے کھلے ہوں گے، ان کی پیشانیاں چمکتی ہوں گی اور دوسرا گروہ عذاب الٰہی کے اندیشہ سے بدحواس ہوگا۔ ان کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے، پیشانیاں سمٹی ہوئی ہوں گی۔ بالکل اسی کے مشابہ تصویر سورۂ عبس میں نظر آتی ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (کچھ چہرے اس دن روشن اور ہشاش بشاش ہوں گے اور

کچھ چہرے غبار آلود ہوں گے، ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی)

اور غور سے دیکھو، یہاں جس طرح انکار کرنے والوں کی دو خصوصیتیں نمایاں کی ہیں، چہرہ کی اداسی اور بدگمانی۔ اسی طرح ماننے والوں کی بھی دو صفتیں بیان کی ہیں، چہرے کی رونق اور امید کی بشاشت۔ اور اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ دوسری صفت درحقیقت پہلی صفت کا سبب ہے۔ خوشی ہو یا غم قلب پر جہاں ان کا اثر ہوا، فوراً ان کے آثار چہرہ پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ متمم بن نویرہ کا مصرع ہے ؎

ولوعة حزن يترك الوجه اسفعا

اس کی مثالیں بہت مل سکتی ہیں۔

'نظر' یہاں انتظار کے معنی میں ہے۔ قرآن مجید میں اس معنی میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (کہا ہم انتظار کریں گے کہ تم نے سچ کہا ہے یا تم جھوٹوں میں ہو) دوسری جگہ ہے۔ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (میں ان کے پاس ہدیے دے کے بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں (انتظار کرتی ہوں) قاصد کیا جواب لے کے لوٹتے ہیں)

اس آیت میں اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ سے ایک گروہ نے رویت باری پر استدلال کیا ہے اور بعضوں نے اس کی تردید کرنی چاہی تو یہ کہہ دیا کہ "الی" "الاء" کی واحد ہے جس کے معنی نعمت کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں محض وہم اور لغت عرب اور اسالیب کلام سے بے خبری پر مبنی ہیں۔ "الاء" کے معنی نعمت کے نہیں آتے۔ ہم اپنی کتاب مفردات القرآن[1] میں اس کی پوری تحقیق لکھ چکے ہیں۔ رہا اس آیت سے رویت باری پر استدلال تو جب ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے غور و فکر کی رسائی سے ارفع و بالا ہے تو اس کی ذات کی تحقیق میں پڑنے سے کیا حاصل؟ کیا اس طرح کا تعمق بربادی دین کے آثار میں سے نہیں ہے؟ اس سے متعلق ہمارے بعض اشارات "لَنْ تَرٰىنِيْ" اور لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کی تفسیر میں ملیں گے۔

۱۶۔ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ۔ اس میں "يُفْعَلُ" بصیغہ مجہول سے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جس طرح نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے اور ہم اس کے لیے ہمیشہ اسی سے لو لگاتے ہیں، اسی طرح عذاب کا سبب خود ہمارا نفس اور اس کی خرابیاں اور آلودگیاں ہیں۔ اس مضمون کو دوسرے مقام میں بالکل واضح کر دیا ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ — جو مصیبت تم کو پہنچی ہے تو یہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کرتوت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہاری بہت سی برائیوں سے درگزر فرماتا ہے۔

یہی اسلوب غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں ملحوظ ہے۔ اس میں غضب کو اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کیا حالانکہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں نعمت کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے

[1] یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عام ہے۔ وہ ہر بندہ پر انعام و احسان فرماتا ہے۔ رہا اس کا غضب تو اس کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی شرارتوں سے اس کے مستحق بن جائیں۔ اس کے خلاف کہیں کہیں جو غضب و انعام اور رحمت و نقمت کو علی الاطلاق اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے تو اس سے اپنے عام عدل اور اپنے عام قانون کا بیان مقصود ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ بندہ اگر انسانیت کے اسفل ترین درجہ میں نہیں گر گیا ہے تو معبود کی ذات اس کے لیے سراپا محبت و محبوبیت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس سے رحمتوں اور برکتوں ہی کا امیدوار رہتا ہے اور ایسی ہی صفتوں اور ناموں سے اس کو پکارتا ہے جو اس کی رحمت اور کریمی کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تفسیر میں اس کے لطائف بیان ہوئے ہیں۔ یہاں اعادہ کی حاجت نہیں ہے۔ پس اگر اس آیت کا مقابلہ اس آیت سے کرو جو اس سے اوپر مومنین کی تعریف میں گزر چکی ہے تو تم کو یہ بات معلوم ہوگی کہ مومن اور منکر کے حالات قیامت کے دن بالکل مختلف ہوں گے۔ مومن اللہ تعالیٰ کی قربت اور رحمت کا امیدوار ہوگا اور منکر اس کی خوشنودی سے مایوس اپنے آپ کو اس سے بہت دور پائے گا۔ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (ہرگز نہیں، اس دن وہ اپنے رب سے دور ہوں گے)

۱۷۔ بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ اس میں ضمیر نفس کے لیے ہے جو محذوف ہے۔ اس حذف کی مثال سورۂ واقعہ میں بھی ہے فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (کیوں نہیں جب کہ جان حلق کو پہنچے گی) چونکہ اس قسم کا حذف عربی زبان میں معلوم و مشہور ہے اس وجہ سے لفظ نفس کا ذکر ضروری نہیں ہوا۔ شعروں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حاتم طائی کا شعر ہے۔

اماوي ما يغني الثراء عن الفتى اذا حشرجت يوماً وضاق بها الصدر

اے ماویہ مال نوجوان کے کیا کام آئے گا جب کہ دم سینہ میں گھٹنے لگے گا۔

اس میں حشرجت کا فاعل نفس ہے لیکن اسی عام قاعدہ کے مطابق، جو اوپر بیان ہوا، اس کو حذف کر دیا ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی موجود ہیں۔ مثلاً مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (اور زمین کی پشت پر کوئی جاندار جیتا نہ چھوڑتا) اس میں "الارض" کا لفظ محذوف ہے۔

اس آیت میں قرأت کا بھی ایک اشکال ہے، اس کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلعم آیات کے آخر میں وقف فرماتے تھے۔ یعنی ان کو آگے سے الگ کر کے تلاوت فرماتے تھے۔ اس کے لیے اہل فن کے یہاں اصطلاحی لفظ فاصلہ ہے۔ یہ فواصل کا معاملہ زیادہ تر صوت و آہنگ کی یکسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ معنی کے فصل و وصل سے اس کو لگاؤ نہیں ہے۔ معنی کا فصل دراصل ایک بالکل دوسری ہی چیز ہے۔ اشعار اور مسجع کلام میں اس کی مثالیں دیکھ کر تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ اب اس اصول کی روشنی میں جو بات یہاں جاننے کی ہے وہ یہ ہے کہ اہل عرب کبھی "ی" کو لفظ کے آخر سے حذف کر دیتے ہیں۔ بالخصوص یائے ساکن میں اس کا یہ ضابطہ بہت چلتا ہے۔ قرآن میں بالخصوص فواصل کے اندر، اس کی مثالیں بہت مل سکتی ہیں۔ مثلاً لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ اس میں "دین" دراصل "دینی" ہے۔ لیکن مذکورہ قاعدہ کے مطابق "ی" حذف ہو گئی ہے۔ اشعار عرب میں تو قوافی

کے علاوہ بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ خنساء کے شعر ہیں۔

وتعذّرت افق البلاد فما بھا وشل لمائح
تذرّی السوافی علی السوا م واجدبت سبل المادح

اس میں سوافی کے آخر سے ی حذف ہوگئی ہے، حالانکہ یہ تراقی کی طرح حالت نصب میں ہے۔ خنساء کا دوسرا شعر ہے۔

فیاعین بکی لامری طار ذکرہ لہ تبکی عین الراکضات السوابح

اس میں تبکی کی 'ی' حذف ہوگئی ہے۔

سیبویہ نے اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل مثال پیش کی ہے:

فطرت بمنصلی فی یعملات دوامی الاید یخبطن السریحا

اس میں لفظ ایدیؔ کی 'ی' حذف ہے۔

الغرض چونکہ عربی زبان میں یائے ساکن کو حذف کر دینے کا قاعدہ موجود تھا اور تراقیؔ کی 'یؔ' بصورت وقف ساکن تھی اس وجہ سے یہ بات جائز ہوئی کہ 'ی' حذف کر دی جائے، پھر ق کو ساکن پڑھا جائے۔ جیساکہ قرآن مجید میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ولی دین کہ دراصل دینی تھا۔ فبشر عباد کہ اصل میں عبادی ہے لما یذوقوا عذاب کہ فی الاصل عذابی ہے۔

۱۸- "قِیْلَ مَنْ رَاقٍ" (پکاریں گے کون ہے جھاڑنے پھونکنے والا) یہ جملہ شدت امر کی تعبیر کے لیے ہے اور یہاں مجہول کا صیغہ غایت درجہ بلیغ ہے۔ گویا ایسا سخت وقت ہوگا کہ کوئی شخص قائل کی طرف متوجہ ہونے والا نہ ہوگا۔ یا یوں کہو کہ اس قول کی اہمیت خود قائل کی شخصیت سے بے پروا کر دے گی۔ ہر شخص کی زبان پر یہی کلمہ ہوگا۔

اور نکرہ سے پہلے مَنْ یا تو شدت طلب کے لیے آتا ہے یا غلبۂ یاس کے اظہار کے لیے۔ طرفہ کا شعر ہے۔

اذا لقوم قالوا من فتی خلت اننی عنیت فلم اکسل ولم اتبلد

(جب قوم پکارتی ہے، ہے کوئی نوجوان! میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اشارہ میری ہی طرف ہے، اور اس وقت میں سستی اور بودے پن کا اظہار نہیں کرتا)

خنساء نے کہا ہے:

یعطی الجزیل ولا یلحی الخلیلؔ ولا یعنی البیل اذا ما قیل من ھاد

---

[۱] اور تمام جگہوں کی راہیں بند ہوگئیں۔ اب ان میں طالبوں کے لیے کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔ [۲] اب یہ اونٹوں (مال و متاع) پر خاک اڑاتی ہیں اور چراگاہوں کے راستے قحط زدہ ہوگئے — سوافی سافیا کی جمع بھی ہے جس کے معنی غبار کے ہیں۔ قال ابوداؤد

ونوئی اموبہ السافیاء کما دس من النون حین امحی

پس تذری کا فاعل افق البلاد ہو سکتا ہے۔ تانیث مضاف الیہ کی رعایت سے ہوگی (مترجم)

[۳] بعض روایات میں "جلیل" کا لفظ ہے مگر ہم کو "خلیل" زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(فیاضی سے بخشتا ہے دوست کی آبروریزی نہیں کرتا اور جب پکار ہوتی ہے کہ ہے کوئی رہبر، تو راستہ نہیں بھٹکتا۔

ان دونوں شعروں میں یہ اسلوب اصلاً تو شدت ضرورت کو ظاہر کر رہا ہے لیکن دوسرے شعر میں کسی قدر یاس کا پہلو بھی نمایاں ہوگیا ہے اور اسی یاس سے انکار کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے جیساکہ استفہام کی خصوصیت ہے، جو ہر زبان میں انکار کے لیے بھی ایک معروف اسلوب ہے، چنانچہ آیت "من الہ غیر اللہ یاتیکم بضیاء" (کون معبود ہے اللہ کے سوا جو تم کو روشنی بخشے گا) میں یہی اسلوب موجود ہے۔

اس تمہید کے بعد اب دیکھنا چاہیے کہ یہاں آیت کا کیا منشا ہے اور یہ اسلوب کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں دو تاویلوں کا احتمال ہے اور ان دونوں تاویلوں میں محض ظاہری فرق ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے بات ایک ہی ہے۔

پہلی تاویل یہ ہے کہ جب موت کی بے ہوشی طاری ہوگی اور جان سینے میں گھٹنے لگے گی تو تیمار دار گھبرا کر پکاریں گے کیا کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا نہیں ہے کہ اس مریض کا علاج کرے۔

اور دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ بس اب معاملہ آخر ہو چکا، اب کون ہے جو اس کو شفا دے سکے۔ یہ شدت یاس کی حالت ہوگی اور یہ سن کر بیمار کو یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کی گھڑی آگئی۔ اس مضمون کو بعض عرب شعراء نے مختلف اسلوبوں سے بیان کیا ہے۔ مثلاً خنساء کا شعر ہے۔

تکن سھام المنایا من یصبن لہ لم یشفہ طب ذی طب ولا راق

(جس کو موت کے تیر لگ گئے اس کو نہ کسی طبیب کی حذاقت شفا دے سکتی نہ کسی جھاڑ پھونک والے کی جھاڑ پھونک)

عدی بن زید نے کہا ہے:

او تکن وجھۃ فتلک سبیل الناس لا تمنع الحتوف الرواقی

(یا وہ راہ کھل جائے گی جو سب کی راہ ہے۔ موت سے تعویذ گنڈے نجات نہیں دلا سکتے)

بہر حال یہ دو تاویلیں ہو سکتی ہیں اور ہم نے دونوں تاویلیں تمہارے سامنے رکھ دی ہیں۔ ان میں سے جو پسند آئے اختیار کرو، باعتبار حقیقت دونوں میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک دوسری تاویل نظم کلام سے زیادہ لگتی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس تاویل کی بعض خوبیوں کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور بعض خوبیاں اگلے صفحات میں بیان ہوں گی۔

۱۹- وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹے گی) کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی چل نہ سکے گا اور یہ بات شدت ضعف کی وجہ سے ہوگی۔ آدمی جب تک زندہ اور طاقت ور ہے ہر میدان میں جولانیاں کرتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پنڈلیاں لپٹ گئی ہیں۔ درید بن صمہ کے یہ دو شعر نگاہ میں رکھو۔

فان یک عبد اللہ خلی مکانہ فما کان وقافا ولا طائش الید

(اگر عبد اللہ نے اپنی جگہ خالی کر دی تو کچھ غم نہیں وہ ڈرپوک اور تیر اندازی میں ناکارہ نہ تھا)

کمیش الازار خارج نصف ساقہ صبروا علی الضراء طلاع انجد

(وہ ہر آن مستعد، چاک و چوبند، مصائب پر ثابت قدم اور بلند کاموں کا ارادہ کرنے والا تھا)

ضعف کی تعبیر و تصویر کے لیے التفات ساق (پنڈلی لپٹنا) نہایت موزوں اور واضح طریق تعبیر ہے۔ انبیاء کے صحیفوں میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ کلام کا مطلب یہ ہوا کہ جب معالج مریض سے مایوس ہو جائیں گے، اعزہ و اقربا سب دستکش ہو جائیں گے، اور جو اعضاء سب سے زیادہ فرمانبردار تھے ان پر بھی قابو باقی نہ رہ جائے گا اور اس کو رب کی طرف اس حالت میں جانا ہوگا کہ بوجھ تو نہایت بھاری ہے مگر سہارا دینے والا ہاتھ کوئی نہیں تو اس وقت اس کا کیا حال ہوگا؟

بعض لوگوں نے ساق کے معنی شدت امر کے لیے ہیں مگر یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کو زبان کے علم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ یہ لوگ مجموعہ اور اجزاء کی دلالت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ "کشف عن الساق" اپنی مجموعی صورت میں سرگرمی، مستعدی اور آمادگی کے مفہوم کے لیے عربی میں استعمال ہے۔ مگر جب یہ الگ الگ آئیں گے تو کشف کے معنی کھولنے اور ساق کے معنی پنڈلی کے ہوں گے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ الگ الگ بھی اسی مفہوم کو ادا کریں۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ یہاں ساق سے مراد دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہے۔ ہمارے خیال میں اس میں روایت کرنے والوں کو وہم ہو گیا ہے۔ اگر روایت صحیح ہے تو اس کو بیان واقعہ سمجھنا چاہیے نہ کہ ساق کی تفسیر۔

۲۰۔ پنڈلی لپٹنے کا مطلب سمجھ لینے کے بعد "اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ" (اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا) کا حسن موقع آپ سے آپ سمجھ میں آجاتا ہے۔ گویا اس سفر کی تیاریوں میں انسان سے جو غفلت ہوئی ہے اس پر سرزنش کی گئی ہے کہ وہ برابر دنیا کی طلب میں منہمک رہا، یہاں تک کہ انہی سرگرمیوں میں اس کی جدوجہد کی تمام طاقت ختم ہو گئی اور پنڈلیاں خشک ہو گئیں، اب وہ اپنے پروردگار کے پاس کس طرح پہنچے گا۔

یہیں سے اس کی احتیاج اور مفلسی کی حالت کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ اگر اس نے نیک کام کیے ہوتے، زکوٰۃ دی ہوتی، نماز پڑھی ہوتی، تو آج کے دن وہی اعمال اس کو سہارا دیتے اور بازو بن کر اس کو اس کے پروردگار کے پاس پہنچاتے۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ۔

یہ تاویل بالکل واضح ہونے کے علاوہ بعد کے مضمون سے نہایت لگتی ہوئی بھی ہے۔ اس کے بعد ہے "ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی" (پھر چل دیا اپنے لوگوں میں اکڑتا ہوا) گویا اس حالت کے مقابل میں وہ حالت دکھائی گئی ہے جب یہ غرہ ختم ہو جائے گا اور وہ کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش ہوگا۔ اس سخت مرحلہ کی تصویر اسی طرح کے تقابل کے ساتھ سورۂ انشقاق میں بھی کھینچی ہے، اس کو دیکھو، یہ تاویل بالکل صاف ہو جائے گا۔

۲۱۔ سورہ کی بقیہ آیات کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہیں۔ اب تم پیچ و خم سے گزر کر تم ہموار راہ پر آگئے ہو لیکن ناموزوں نہ ہوگا اگر چند لفظوں میں یہاں نماز کی اہمیت کی طرف اشارہ کر دیا جائے، ہر چند کہ اس پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب اصول الشرائع[1] میں کر چکے ہیں۔

[1] مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کا معتدبہ حصہ لکھا ہے اور اس میں دین کی نہایت اہم حقیقتوں کو واضح کیا ہے لیکن ابھی تک اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

نماز اور زکوٰۃ یہی دو شریعت کے ابتدائی نقطے ہیں۔ انہی سے ایمان کی اصل حقیقت وجود میں آتی ہے۔ قرآن کی بہت سی آیتیں اس دعوٰی پر حجت ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی جب شریعت کی اولین باتوں کی بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے انھیں دونوں کا نام لیا۔ رہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ نجات کے لیے محض ایمان کافی ہے تو افسوس ہے کہ انھوں نے ایمان کی حقیقت بالکل نہیں سمجھی۔ ایمان عمل سے کیسے بے نیاز کر سکتا ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت کا کیا جواب ہوگا۔

یَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ حَتّٰٓی اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ (مدثر)

پوچھ گچھ کرتے ہوں گے مجرموں کے متعلق کیا چیز تم کو لے گئی دوزخ میں۔ جواب دیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہو کر بحث کرتے تھے اور جزا کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ یقین کا دن آگیا۔ پس سفارش کرنے والوں کی سفارش سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوگا۔

اس آیت نے نماز کی عظمت پوری طرح آشکارا کر دی۔

اس کے علاوہ آیات ذیل بھی قابل غور ہیں۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ۔ (الزخرف ۔ ۳۶)

اور جو خدائے مہربان کی یاد سے اعراض کرتا ہے ہم اس کے لیے ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔

اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (مریم ۔ ۵۹)

انھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑے پس اپنی گمراہی سے دوچار ہوں گے۔

ان آیات میں نماز چھوڑنے کا لازمی نتیجہ گمراہی، انکار اور شفاعت سے محرومی قرار دیا ہے اور دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ نماز مومن مخلص کے علاوہ سب پر شاق ہے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔

اور نماز بھاری ہے مگر خدا سے ان ڈرنے والوں پر جو گمان رکھتے ہیں کہ انھیں اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہونا ہے اور ان کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

اس کے متعلق ضروری تفصیلات سورۂ فاتحہ اور بقرہ کی تفسیر میں پاؤ گے۔

۲۲۔ اس سورہ کا ربط ماسبق سورت سے پہلی فصل میں بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ان میں کلام سختی و درشتی کے انتہائی نقطہ سے آہستہ آہستہ اعتدال کے نقطہ تک اترا ہے اور پھر زجر و توبیخ کی ایک معتدل حرارت کے ساتھ ان میں شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے اور دلائل بیان ہوئے ہیں اور ان دونوں سورتوں میں خطاب منکرین

سے تھا لیکن بعد کی سورہ، سورۂ دہر میں، خطاب مومنین کی طرف ہو جاتا ہے گویا منکرین سے جو بات کہنی تھی وہ پوری ہوگئی اور اب ضروری ہوا کہ ان سے اعراض کیا جائے۔

ہر چند ان آیتوں میں سورہ کا عمود ایک ہی ہے لیکن ان میں کلام تدریجاً سختی و درشتی سے نرمی و اعتدال اور زجر و توبیخ سے اعراض و امہال کی طرف اترا ہے تاکہ مخاطب کو غور و فکر کا موقع ملے۔ ان تینوں سورتوں کی تفسیر پڑھنے کے بعد ان کا باہمی تعلق اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ یہاں ہر ایک پر تفصیل سے بحث کا موقع نہیں ہے۔ ذلک واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ احکم۔